ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

OPEN ACCESS
CC BY NC

ڈاکٹر تقدیس زہرا
ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ جناح گریجوایٹ کالج برائے خواتین، مزنگ، لاہور ۔
مس حافظہ اقرا رحمٰن
لیکچرار، شعبہ اردو، فضائیہ کالج آف ایجوکیشن فار ویمن، سرور روڈ، کینٹ، لاہور۔
مس نمرہ رحمٰن
لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ جناح گریجوایٹ کالج برائے خواتین مزنگ، لاہور

اے حمید کے کالموں میں تہذیبی و تاریخی عناصر

Dr. Taqdees Zahra*
Associate Professor, Urdu Dept. ,Govt. Jinah Graduate College for women mazang, Lahore.
Miss Hafiza Iqra Rahman
Lecturer, Urdu Dept, Fazaiya College of Education, Sarwar Road, Cantt, Lahore.
Miss Nimrah Rahman
Lecturer, Urdu, Dept. Govt. Jinah Graduate College for women mazang, Lahore.

***Corresponding Author:**

Cultural and Historical Elements in A.Hameed's Columns

A.Hameed (1928-2011) is widely recognized for his immense contribution to Urdu fiction, espcially for bringing a romantic, dreamy style to his narratives. He wrote more than two hundred novels and short stories in Urdu. Barish, Samawar Aur Khushbu is a celebrated biological work by A.Hameed. The book often focuses on themes of nostalgia, nature and the romantic atmosphere of Kashmir and Lahore, often highlighting the scenic, rainy ambiance (Barish/Samawar). It rflects the author's deep observational skills and

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

his abilityto transform ordinary encounters into meaningful literacy expressions. Throughvivid descriptions and reflective storytelling, A.Hameed captures the essence of different places, particularly highlighting the social, historical and emotional landscapes associated with them. Ultimately Barish, Samawar Aur Khushbustands as a significant contribution to Urdu prose, offering insights into the beauty of travel, memory and cultural harmony.
Key Words: *Nostelgia, Nature, Travel, Memory, Culture, Cultural Harmony.*

اے حمید کے کالموں کا مجموعہ "بارش، سماوار، خُوشبُو" کے نام سے مقبول اکیڈمی نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ اے حمید کے یہ کالم اِمروز اخبار اور نوائے وقت میں چھپتے رہے۔ یہ کالم شخصیات، لاہور کی یادوں، عمارتوں، چائے خانوں، ماضی کی یادوں اور محبت کی باتوں سے مزین ہیں۔ اس کتاب میں اے حمید کے ستائیس کالم شامل ہیں اور یہ سب ان کی شگفتہ تحریر کی مثال ہیں۔

انسانی زندگی کی اہم ترین خصوصیت تہذیب و ثقافت ہے جو تاریخی طور پر منتقل ہوتی ہے۔ ثقافت عربی زبان کے لفظ "ثقف" سے نکلا ہے جس کے معنی ہنر یا سیکھنے کے ہیں۔ انگریزی میں اس کا مترادف لفظ "کلچر" استعمال ہوتا ہے جس کے اصطلاحی معنی جامع طرزِ زندگی کے ہیں۔ گویا ثقافت ایسی جامع اصطلاح ہے جس میں طرزِ معاشرت یا طریقِ زندگی کے تمام نمونے آجائیں۔ اردو انسائیکلوپیڈیا میں درج ہے:

> "عربی لفظ ثقافت، جس سے مراد کسی قوم یا طبقے کی تہذیب ہے۔ علما نے اس کی یہ تعریف مقرر کی ہے۔ ثقافت اکتسابی یا ارادی یا شعوری طرزِ عمل کا نام ہے۔ اکتسابی طرز عمل میں ہماری وہ تمام عادات و افعال۔ خیالات، رسم اور اقدار شامل ہیں جن کو ہم ایک منظم معاشرے یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں یا ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تاہم ثقافت یا کلچر کی کوئی جامع و مانع تعریف آج تک نہیں ہو سکی"۔[1]

کلچر، روحانی اور مادی ہر دو صورتوں پر محیط ہے۔ اس کی جامع اور مکمل تعریف ممکن نہیں۔ یہ زندگی کی کلیت پر محیط ہے اور ہر گزرتا دن ماضی کا قصہ اور طریقہ، کلچر کا حصہ بن جاتا ہے۔ کتاب "بارش، سماوار اور خوشبو" میں یہی بات اے حمید کا بھی نقطہ نظر بن کر سامنے آتی ہے اور ہر قصے کے ساتھ مصنف کا ذاتی اور جذباتی تجربہ بھی دکھائی دیتا ہے جیسا کہ ریڈیو پاکستان سے اے حمید کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

اے حمید نے ریڈیو پاکستان کے لیے بہت کام کیا اور انھیں یہاں بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔ یہاں ان کی بہت سی شخصیات سے ملاقات ہوئی جو اے حمید کو نکھارنے کا سبب بنے۔ انھی شخصیات میں سے ایک عرفانی صاحب تھے۔ عرفانی صاحب سے اے حمید کی ملاقات ریڈیو سٹیشن پر ہوئی۔ عرفانی صاحب عربی، فارسی اور انگریزی کے عالم تھے۔ اے حمید عرفانی صاحب کی شخصیت کے گرویدہ تھے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"میں صبح جلدی بیدار ہونے والا آدمی ہوں اور ریڈیو سٹیشن پر بھی صبح وقت سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔ دل اس خیال سے بڑا مسرور ہوتا کہ صبح کی پہلی چائے عرفانی صاحب کے ساتھ پیوں گا، عفانی صاحب ان دنوں باغپوری میں رہتے تھے۔ ہماری صبح کی ملاقات کا وقت طے ہوتا تھا۔ چنانچہ کسی دن عرفانی صاحب کو ذرا دیر ہو جاتی تو میں ریڈیو سٹیشن کے گیٹ کے پاس آکر ادھر اُدھر ٹہلنے لگتا۔ گرمیوں کا موسم ہوتا تو موتیے کے کچھ پھول توڑ کر رکھ لیتا کہ عرفانی صاحب کو دوں گا۔ اس دروان میرے کئی موسیقار، سازندے اور پروڈیوسر دوست میرے قریب سے گزرتے ہوئے چائے کی دعوت دیتے لیکن میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اُن کی دعوت ٹال دیتا۔ جو کوئی اصل بات جانتا وہ مسکرا کر کہتا "ہمیں معلوم ہے تم عرفانی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیو گے""۔ (۲)

عرفانی صاحب قرآنِ پاک کو سمجھنے والے انسان تھے اور اس پر چلنے کو ہی بنی نوع انسان کی نجات سمجھتے تھے۔ قصیدہ بردہ شریف ان کو زبانی یاد تھا اور اے حمید کی فرمائش پر انھوں نے پورا قصیدہ اُردو میں سنا ڈالا۔ اے حمید کہتے ہیں کہ عربی زبان کے مادے اور ابواب انھوں نے عرفانی صاحب ہی سے سیکھے۔ عرفانی صاحب کے انتقال کی خبر بھی اے حمید کو ریڈیو سٹیشن پر ملی۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"اس روز میں ریڈیو سٹیشن پر ہی تھا کہ عرفانی صاحب کے انتقال کی پُر ملال خبر سنی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شے مجھ سے الگ ہو گئی ہے۔ میرے کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ عرفانی صاحب اتنی جلدی ہم سے الگ ہو جائیں گے۔ میری ان کی صرف دوستی ہوتی تو شاید مجھے صبر آ جاتا۔ مگر میں ان سے محبت کرتا تھا اور محبت میں صبر آیا نہیں کرتا، کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عرفانی صاحب کی پُر نور روح کو جنت الفردوس میں بلند ترین درجات عطا فرمائے۔ آمین"۔ (۳)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

اے حمید انتہائی محبت کرنے والی شخصیت تھے۔ وہ ہر شے سے محبت کے قائل تھے۔ ان کی محبت شخصیت کے ساتھ ساتھ عمارتوں، درختوں، پودوں اور شہروں کے ساتھ دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ اے حمید کو لاہور اور امرتسر سے بے حد محبت تھی۔ امرتسر ان کی جنم بھومی ہے جہاں کی فضا تک سے ان کو انسیت اور لگاؤ ہے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"جب میں مسلم امرتسر کا ذکر کرتا ہوں یا اسے یاد کرتا ہوں تو میری مراد وہاں کے اینٹ پتھروں کے مکان نہیں ہوتے بلکہ اس شہر کی ایک خاص فضا، اس کے رنگ اور اس کی ایک خاص خوشبو ہوتی ہے جو امرتسری مسلمانوں کے دم قدم سے قائم تھی اور جو امرتسر سے مسلمانوں کے ہجرت کر جانے کے ساتھ ہی غائب ہو گئی۔ یہ امرتسر مسلمانوں کے کلچر، ان کی مذہبی اور علمی ادبی اور معاشرتی ثقافت، ان کے رہن سہن، ان کی دینی روایات اور ان کی مسجدوں کی اذانوں، ان کے تہواروں، عید، شب برات اور رمضان المبارک کی خوشبو تھی"۔(۴)

اے حمید ان خوشبوؤں کو بہت یاد کرتے ہیں کیوں کہ یہ اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں اے حمید لکھتے ہیں:

"قیام پاکستان کے ایک سال بعد جب میں امرتسر گیا تو وہ امرتسر جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میرا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کا زمانہ گزرا وہ مجھے ایک اجنبی شہر لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خوشبوئیں جنھوں نے میری پرورش کی تھی غائب تھیں۔ مسلمانوں کے مکانوں کی وہ کھڑکیاں جن پر حیاداری کی چلمنیں پڑی ہوئی تھیں اب اس حیاداری سے محروم آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھیں"۔(۵)

امرتسر کا کمپنی باغ مشہور ہے۔ اے حمید کا بچپن اور لڑکپن اسی باغ میں گزرا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد امرتسر میں کافی کچھ بدل گیا جسے اے حمید جیسے حساس ادیب نے فوراً محسوس کیا۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"کمپنی باغ کے درخت، پودے، روشیں سب اپنی جگہ پر موجود تھیں لیکن کمپنی باغ کے چہرے سے وہ روحانیت غائب تھی جو کمپنی باغ کی دیکھ بھال کے انچارج چوہدری نور الٰہی صاحب کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ اسے میں نے کمپنی باغ میں داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا۔ پورے گھاس کھود رہے تھے۔ پھولوں کی کئی کیاریاں سوکھی پڑی تھیں۔ ٹھنڈی

ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

کھوئی کے پاس جو چھوٹی سی مسجد ہوا کرتی تھی اس کا سارا سنگ مرمر ہندو سکھ اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب وہاں صرف مٹی کا چبوترا ہی رہ گیا تھا"۔ [۶]

قیام پاکستان کے بعد بہت سی چیزیں بدل گئیں۔ نہ صرف امرتسر میں بلکہ پاکستان کے اپنے شہر لاہور میں کئی چیزیں اور عمارتیں تبدیل ہو کر رہ گئیں جن میں چائینیز لنچ ہوم اور پاک ٹی ہاؤس کی رونقیں اب بالکل ماند پڑ چکی ہیں نہ وہ ادب دوست رہے، نہ ادب نواز۔ ٹی ہاؤس کی رونقیں ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے دم سے قائم تھیں جو صبح صبح یہاں آن وارد ہوتے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"ہماری خواہش ہوتی تھی کہ صبح صبح چائے کی رسم افتتاح ٹی ہاؤس میں ہی ادا کی جائے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ صبح صبح ٹی ہاؤس میں چائے کا پہلا کپ پینے میں کیا ارمان تھا، کیا شاعری تھی، کیا جلال تھا۔ ہاف سیٹ چائے کی چینک میں سے چائے نہیں نکلتی تھی روشنی نکلتی تھی۔ چائے جب کپ میں گرتی تو کپ روشن ہو جاتا۔ ایسے لگتا جیسے کپ میں سورج طلوع ہو رہا ہے۔ وہ صرف چائے ہی نہیں تھی وہ ناریل اور بانس کے درختوں کی جھیلوں میں رات کے اندھیروں میں کھلنے والے کنول پھولوں کی خوشبو تھی۔ بنگال کے دریاؤں میں طلوع ہوتے سورج کے ساتھ کشتیاں کھینچنے والے ملاحوں کی دور سے آتی لوگ گیتوں کی اداس آواز تھی جس نے اس زمانے کے ٹی ہاؤس کی چینک میں آکر چائے کا روپ بدل لیا تھا۔ وہ چائے باتیں کرتی تھی، شاعری کرتی تھی، رومانس کرتی تھی۔ اس کی باتوں میں مولسری، موتیے اور جنگلی گلابوں کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ وہ سورج بن کر طلوع ہوتی اور روشنی بن کر روح کی وادیوں، پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں میں پھیل جاتی تھی"۔ [۷]

ٹی ہاؤس کی رونقیں اور گہما گہمی آج نہیں رہیں جو یہاں آنے والے لکھاریوں کے دم سے تھیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا اور ہر شے کو زوال ہے۔ ٹی ہاؤس کے مالک کا کہنا ہے کہ اب وہ بات نہیں رہی نہ وہ حالات۔ لیکن اس کے باوجود زاہد صاحب اپنے پرکھوں کی ساکھ کو برقرار رکھنے کوشش میں مشغول ہیں۔

اے حمید قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ جہاں انھوں نے ایک بھرپور وقت گزارا۔ کئی شعرا اور ادبا سے ملاقات کی اور کئی فن کاروں کے فن کو دیکھا اور پرکھا۔ ہفتے میں دو دن تو لازمی ریڈیو

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

سٹیشن کا چکر لگاتے اور کوئی نہ کوئی پروگرام ریکارڈ کرواتے۔ ریڈیو سٹیشن اور چائے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اے حمید ریڈیو سٹیشن جاتے تو احباب کے ساتھ چائے کا دور ضرور چلتا۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"جس روز ریڈیو سٹیشن جاتا ہوں تو وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی خوشی سے تین چار پیالیاں چائے کی ضرور پی لیتا ہوں۔ کیوں کہ ریڈیو سٹیشن اور چائے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک دفعہ کینٹین چھے سات دنوں کے لیے بند ہوگئی تو ہر کوئی منھ لٹکائے پھر رہا تھا۔ میں نے ناصر قریشی سے کہا "تم تھرمس میں چائے کیوں نہیں لے آتے؟" وہ بولا "تھرمس کی چائے میں ایک خاص قسم کی بُو پیدا ہو جاتی ہے جو ناگوار گزرتی ہے"۔ ریڈیو سٹیشن پر ہر کوئی چائے کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتا ہے اسی لیے کہ یہاں کا ماحول ادبی اور فنکارانہ ہے"۔ (۸)

ریڈیو سٹیشن کی فضا اب کافی بدل گئی ہے کچھ پرانی قدریں ٹوٹ گئی ہیں اور کچھ نئی قدریں تعمیر کے مرحلے میں ہیں۔ یہ عمل ہر عہد میں جاری رہتا ہے۔ اے حمید ریڈیو سٹیشن پر گزرے وقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں تو ریڈیو سٹیشن پر گزرے ہوئے حسین لمحوں کو اس لیے یاد کرتا یوں کہ میرا دل ابھی زندہ ہے اور میں لذتوں کا آدمی ہوں اور دل کے جذبوں کی قدر کرتا ہوں اور انھیں دنیا کی بہت بڑی دولت سمجھتا ہوں۔ اس خوشی میں جو اداسی کی ہلکی گلابی سی لہر شامل ہوتی ہے مجھے وہ بھی اچھی لگتی ہے"۔ (۹)

اے حمید ان لوگوں میں سے ہیں جو زندگی کے دکھوں سے بھی لذت کشید کرنے پر قادر ہیں۔ ریڈیو سٹیشن پر انھیں ایک سے ایک فن کار سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان کے فن سے حظ اٹھانے کا موقع ملا۔ انھی فنکاروں میں سے ایک "اچھی" تھا۔ یہ وائلن بجاتا تھا اور صبح صبح جوگیا راگ لگاتا تھا۔ قدیم دور کے درویش صفت استادوں نے خالق حقیقی کی مناجات گانے کے لیے راگ بنائے تھے جن میں سے جوگیا راگ بھی ہے۔ اس راگ کے سروں میں بھی دیگر راگوں کی طرح خالق کل کے سامنے اپنی عاجزی اور کم مائیگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اے حمید اتوار کے اتوار اچھی سے ملتے اور وہ انھیں جوگیا راگ سناتا۔ راگ کے سروں کے ابھرنے پر جو فضا بنتی، اے حمید اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"سٹوڈیو کی ساؤنڈ پروف فضا میں جوگیا راگ کے عاجزانہ سر روشن ہونے شروع ہوگئے۔ تھوڑی کے نیچے ٹکائے ہوئے وائلن پر اچھی کی انگلیاں سروں کا جادو جگا رہی تھیں۔ ان کی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

آنکھیں بند تھیں اور کشادہ چہرے پر روح کے اس کرب اور عجز کا گداز نمایاں ہو رہا تھا جس کا اظہار اس نے کبھی کسی کے آگے نہیں کیا تھا۔ جب اس نے وائلن بجانا بند کیا تو میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا "یہ راگ ہی ایسا ہے""۔(۱۰)

اسی ریڈیو سٹیشن کے میوزک سٹوڈیو میں امانت علی بھی ہوا کرتے تھے جو اے حمید کے بہترین فن کار رفقا میں سے ایک تھے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"اسی میوزک سٹوڈیو میں ایک طرف بڑا ساپیانو رکھا ہے۔ اسے پاکستان کے کئی نامور موسیقاروں نے بجایا ہے۔ اسی پیانو کے کنارے پر اپنا سلگتا ہوا سگریٹ رکھے استاد امانت علی خان نے آتش کی مشہور غزل کی طرز بنائی تھی۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

میں اس وقت امانت کے پاس ہی پیانو سے ٹیک لگائے کھڑا تھا امانت علی کی آواز میں بھی اس کی شخصیت کی طرح ایک مردانہ وجاہت تھی۔ آواز میں درد اور سوز بھی تھا۔ مردانہ وجاہت والی آواز میں سوز و درد عام طور پر نہیں پایا جاتا مگر امانت علی کی آواز میں اس کے دل کا سوز شامل ہوتا تھا۔"(۱۱)

ریڈیو سے اے حمید کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اے حمید کا ریڈیو سے تعلق آٹھویں جماعت سے تھا۔ نوکری کے نام پر اگر انھوں نے کہیں کام کیا ہے تو وہ صرف ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اے حمید کہتے ہیں:

"ریڈیو سٹیشن کی فضاؤں میں آج بھی میرے لیے ایک طلسم کی سی کیفیت ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ساز و آواز کے اس ادارے سے میرا تعلق بڑا پرانا ہے"۔(۱۲)

اے حمید کے کالموں میں گم شدہ چہرے، عمارتیں اور اشیا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ ان تمام کا بیان بڑی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ کرتے ہیں کہ قاری بیان کردہ واقعے کو اپنی تصوراتی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے، عمارتوں کی سیر کرتا ہے اور اجنبیوں سے آشنائی ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے مثال ملاحظہ ہو:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

"اخلاق احمد دہلوی سے میری ملاقات لاہور ہوٹل والے چوک میں ہوئی۔ اس سے پہلے میں انھیں ریڈیو پاکستان لاہور کی پرانی عمارت میں ایک دوبار دیکھ چکا تھا اور رسالہ "ترقی" میں ان کے طنزیہ مضامین بھی پڑھ چکا تھا۔ ان ہی دنوں رسالہ ادب لطیف میں میرا ایک افسانہ چھپا تھا جو اخلاق صاحب کو بہت پسند آیا تھا۔ میں لاہور ہوٹل کی طرف جارہا تھا وہ سامنے سائیکل پر سوار آرہے تھے، کھدر کا کرتا، چوڑی دار پاجامہ اور سولہ ہیٹ، سائیکل چلاتے وقت وہ سولہ ہیٹ سائیکل کے آگے لگی ٹوکری میں رکھ لیتے تھے۔ مجھے دیکھ کر سائیکل سے اتر پڑے۔ ہاتھ نہیں ملایا مگر بڑی گرمجوشی سے ملے اور میرے افسانے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اخلاق صاحب ہاتھ ملانا حفظان صحت کے اصولوں کے خلاف سمجھتے تھے ایک بار وہ ریڈیو سٹیشن کے ڈیوٹی روم میں بیٹھے رجسٹر میں کچھ لکھ رہے تھے کہ ایک صاحب نے آداب عرض کہہ کر ہاتھ آگے کر دیا، اخلاق صاحب نے سلام کا جواب برے اخلاق سے دیا مگر ہاتھ نہیں ملایا اور کام کرتے گئے۔ اس شخص نے بھی یہ نہ سوچا کہ ایک آدمی برے انہماک سے کام کر رہا ہے اسے کام کرنے دو۔۔۔ خواہ مخواہ ہاتھ ملا کر اس کو کام کرتے روکنے کی کیا ضرورت ہے جب اس شخص نے کہا جناب ہاتھ تو ملائیے تب اخلاق احمد دہلوی نے جواب میں کہا" بھائی آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا ہاتھ کام کرنے میں مصروف ہے""۔ (۱۳)

اخلاق احمد دہلوی ریڈیو پاکستان لاہور کی پہچان ہوا کرتے تھے سادگی اور رواداری ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ ہاتھ ملانا گو کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن بعض موقعوں پر مروتاً انھیں ہاتھ ملانا پڑتا۔ ایسے موقعوں پر وہ یہ ضرور کہہ دیتے کہ نہ جانے ہاتھ ملانے کی رسم کیوں ایجاد کر لی گئی۔ اخلاق صاحب درد دل رکھنے والے آدمی تھے۔ کسی کی دکھی بپتا سنتے تو آب دیدہ ہو جاتے۔ ریڈیو سٹیشن پر کوئی ان کے لیے چائے منگواتا تو وہ اپنی پیالی کے الگ پیسے دیتے۔ کیوں کہ وہ ذرا برابر بھی کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ انھیں اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا مگر خود بہت کم کھاتے تھے۔ دستوں پر بے دریغ خرچ کرتے۔ مشاعروں کا بھی اہتمام کرتے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"جب تک وہ ریڈیو سے منسلک رہے خطوں کے جواب دیتے رہے اور ریڈیو اناؤنسر رہے۔ مشاعروں کو بھی وہی کنڈکٹ کرتے اور ان کا انداز سب سے جدا اور شاعرانہ ہوتا تھا۔ ریڈیو

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

پر ان کا یہ ابتدائی جملہ ایک مدت تک گونجتا رہا: "سننے والوں کی خدمت میں اخلاق احمد دہلوی کا سلام پہنچے" آج یہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہے مگر ان کی باتیں، ان کی یادیں ان کی وضع داری اور اخلاق ہمارے دلوں میں اسی طرح زندہ ہے"[۱۴]

اے حمید ایک وضع دار اور با مروت انسان تھے۔ وہ اخلاقی قدروں سے مالا مال تھے اور رشتوں میں خلوص اور دیانت داری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اے حمید کافی حد تک روایت پرست تھے اور یہ چیز ان کی تحریروں میں بھی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے ان کے ایک کالم کا عنوان "رش مالو۔ ایک گمشدہ روایت" ہے جس میں وہ امر تسر اور کشمیری کلچر پر بات کرتے نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہ مضمون لکھتے وقت کئی بار کلچر کا لفظ آیا ہے اور جب بھی کلچ کا لفظ اتا ہے مجھے امر تسری قلچے یاد آ جاتے تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ قلچے اور خاص طور پر امر تسری قاندروؤں (نان بائیوں) کے قلچوں کا کلچر سے ایک گہرا تعلق ہے۔ قلچہ ہٹالیں تو امر تسری کلچر غائب ہو جاتا ہے کلچر کا لفظ کاٹ دیں تو قلچہ روپوش ہو جاتا ہے"۔[۱۵]

کشمیری کلچر کی خاص اور متبرک ڈش رش مالو ہے۔ اس ڈش کو ایک بزرگ سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا نام رش مالو تھا یہ دراصل رش مالو بزرگ کی نیاز کے طور پر بنائی جاتی تھی جو صرف لڑکیاں اور خواتین ہی کھاتی تھیں۔ یہ نیاز عموماً گھر میں ہی دی جاتی۔ اس موقع پر اُبلے ہوئے چاول، ثابت مونگی کی دال، کھٹیاں مولیاں، ابلے ہوئے انڈے اور بینگن بنائے جاتے۔ اس پکوان کا نام ہی رش مالو پڑ گیا۔

رش مالو بزرگ دن رات اللہ کی عبادت کرتے۔ کوئی حاجت مند ان کے در سے خالی نہ جاتا۔ وہ گوشت سے پرہیز کرتے تھے اور صرف چاول کھاتے تھے جسے کشمیری زبان میں بتہ کہا جاتا ہے۔ اے حمید رش مالو کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"رش مالو بزرگ کی نیاز کے دن گھر کے مردوں کو بھی کہا جاتا تھا کہ نہا دھو کر نئے کپڑے پہنیں اور باوضو رہیں۔ اس کے بعد ایک بزرگ خاتو رش مالو کا پکوان تیار کرنے لگ جاتی تھی۔ اس پکوان کی تیاری منھ اندھیرے اذان کے وقت ہی شروع ہو جاتی تھی کیوں کہ اس نیاز کے لیے خاص طور پر دوپہر کا وقت متعین ہوتا تھا۔ اس وقت خواتین گھر کے کسی بڑے کمرے میں جمع ہو جاتیں۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد نعت شریف پڑھی جاتی۔ اس کے بعد

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

درود و سلام کی مجلس ہوتی۔ ختم شریف ہوتا اور پھر اسے بند کمرے میں مہمان خواتین کو رش مالو کا پکوان پیش کیا جاتا۔ محلے کی جن خواتین کو نیاز کا تبرک تھالی میں سرپوش سے ڈھانپ کر بھیجا جاتا تھا اسے لڑکیاں ہی لے کر جاتی تھیں۔ کسی مرد کی اُس پر نظر بھی نہیں پڑنے دی جاتی تھی"۔ (۱۶)

رش مالو کے نیاز کے چاول دن ہی دن میں ختم کر دیے جاتے تا کہ کسی مرد کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔ اے حمید اس میں چھپا راز آج تک نہیں جان سکے۔ اے حمید فراز سے بھی میل جول رکھتے تھے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"گزشتہ دنوں برسی والے پروگرام میں ہی نور جہاں کی آواز میں احمد فراز کی غزل سنی تو احمد فراز بہت یاد آیا۔

سلسلے توڑ گیا وہ بھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

احمد فراز کی غزل کا مطلع میں اسی کو مخاطب کر کے سنانا چاہتا ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہفتے دس دن میں احمد فراز سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ تب خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک وہ زمانہ بھی آئے گا جب مہینے گزر جائیں گے اور اپنے پرائے اور پیارے دوستوں سے ملنا نہیں ہو گا۔ کبھی کبھار وہ ٹیلی ویژن پر نظر آجاتا ہے اور دل کو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ اب بھی خوب صورت اور رومان انگیز ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ احمد فراز کو اسی طرح خوب صورت اور رومان انگیز رکھے۔" (۱۷)

اے حمید کا مرتسریوں کے ساتھ خوب دل بہلتا ہے۔ امرتسر جو ان کی جنم بھومی ہے، انھیں ہمہ اپنی آغوش میں سمیٹے رہتی ہے۔ وہ کوئی بھی بات کریں، امرتسر کا حوالہ دینا نہیں بھولتے۔ وہ انتہائی ماضی پرست اور رومانی شخصیت ہیں جو ہر شے کو رومانی انداز میں پیش کرنے اور دیکھنے کے قائل ہیں۔ صاغر صدیقی میں بھی انھیں اپنی جھلک نظر آتی ہے کیوں کہ وہ امرتسریوں میں شامل اور ان سے محبت کرنے والا انسان تھا۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"مشہور درویش صفت شاعر ساغر صدیقی نے شیراز ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں اپنا عارضی ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ یہ اس کے آغاز کا زمانہ تھا۔ دبلا، پتلا، خوش لباس، چمکیلے بالوں والا نوجوان تھا۔ وہ بھی ہم سب امرتسری دوستوں کے ساتھ امرتسر سے ہجرت

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

کر کے لاہور آیا تھا۔ غزل کا شاعر تھا اور اس زمانے میں برے اچھے شعر کہتا تھا۔ شام کے وقت کبھی شیراز ہوٹل کبھی سامنے والے پنجاب ہوٹل اور کبھی کشمیر ہوٹل میں محفل لگتی۔ شعر و شاعری ہوتی۔ ادب اور سیاست پر گفتگو ہوتی"۔ (۱۸)

اے حمید "لاہور کے گم شدہ منظر" کے عنوان سے لاہور میں تعلیمی پسماندگی کا ذکر کرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے محض سات برس قبل اگر لاہور کی تعلیمی حالت پر نظر دوڑائی جائے تو مسلمانوں کی اکثریت تعلیم سے نابلند نظر آتی ہے۔ گورنمنٹ کالج تک میں محض بارہ مسلمان اساتذہ دیکھنے کو ملتے ہیں جو صرف مشرقی علوم کے ماہر تھے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"پاکستان کے قیام سے صرف ۷ برس پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے ۱۹۳۹ء کے پرسپکٹس پر ایک نظر دوڑائیں تو تدریسی عملی کی ۴۲ اساتذہ کی فہرست میں چند ایک انگریز اساتذہ کے سو اکثریت ہندو پروفیسر حضرات کی نظر آتی ہے جب کہ صرف بارہ مسلمان اساتذہ کے نام اس فہرست میں شامل دکھائی دیتے ہیں جو انگریزی ادب، فلاسفی، سائیکالوجی، عربی، فارسی، اردو اور تاریخ جیسے مضامین پڑھایا کرتے تھے۔ ان میں کوئی اساتذ سائنسی مضامین نہیں پڑھاتا تھا۔ فزکس، کیمسٹری، باٹنی، زولوجی، ریاضی اور اکنامکس پڑھانے والے سبھی اُستاد ہندو تھے۔" (۱۹)

شہر لاہور میں اگرچہ مسلم اکثریت تھی لیکن تعلیمی اعتبار سے وہ پسماندہ تھے۔ اس کا اندازہ لاہور میں واقع ہندو اور مسلمانوں کے تعلیمی اداروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

قیام پاکستان سے لے کر اب تک ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصے میں لاہور شہر کی شکل کافی حد تک تبدیل ہو گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور کے منظر نامے تبدیل ہو چکے ہیں۔ کچھ منظر دھندلا گئے ہیں اور کچھ اس قدر بدل گئے ہیں کہ پہچان میں نہیں آتے اور کچھ تو سرے سے غائب ہو گئے ہیں۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"مثال کے طور پر شاہراہ قائد اعظم (دی مال) کے ریگل چوک کو ہی لے لیں۔ چوک میں جہاں بیڈن روڈ آکر ختم ہوتی ہے، وہاں سے بائیں جانب مریں تو سب سے پلے کونے والی سکان لاہور کے مشہور گوٹو گرافر بھٹی فوٹو گرافر کی تھی۔ پورٹریٹ بنانے میں بھٹی صاحب کا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

جواب نہیں تھا۔ چھوٹا سا سٹوڈیو ہوتا تھا جہاں ہر قسم کی لائینیں لگی ہوئی تھیں۔ اب پتہ نہیں بھٹی صاحب کا یہ فوٹو سٹوڈیو ہے یا نہیں"۔ (۲۰)

بیڈن روڈ سے ایک راستہ پریس کو جاتا ہے۔ جہاں ایک منزلہ عمارت ہوا کرتی تھی۔ اب یہ عمارت غائب ہو چکی ہے اور اس کی جگہ شاپنگ مال نے لے لی ہے۔ اس ایک منزلہ عمارت کے آگے ایک اور عمارت تھی جو قدیم طرز کی حامل تھی۔ اے حمید جب بھی امرتسر سے لاہور آتے تو اس عمارت میں حمید نظامی سے ضرور ملاقات کرتے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"میں امرتسر سے جب بھی لاہور آتا تو صرف حمید نظامی صاحب کی نیاز حاصل کرنے۔ بلکہ انھیں دیکھنے کے لیے بیڈن روڈ والے سفتر ضرور اتا تھا۔ دوسری منزل والے کمرے میں ایک بڑی سی میز بچھی ہوتی تھی۔ اس میز کے پیچھے حمید نظامی بیٹھتے تھے۔ سامنے چار پانچ کرسیاں رکھی ہوتی تھیں۔ میں نے پہلی مربہ م۔ش صاحب کو اسی آفس میں دیکھا تھا۔ وہ ان کی ڈھلتی جوانی کا زمانہ تھا اور مجھے یاد ہے کہ ان کے سر پر بڑے گنجان بال ہوا کرتے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر سے انگریزی میں بات کر رہے تھے اور مجھے یاد ہے حمید نظامی صاحب ان کی طرف دیکھ کر ہلکے ہلکے مسکرا رہے تھے۔ نوائے وقت اخبار کے دفاتر وغیرہ اوپر والی یعنی تیسری منزل پر ہوتے تھے جہاں ایک مہندی رنگی داڑھی والا بزرگ خزانچی یا شاید ہیڈ کلرک بڑی کرسی پر بیٹھا ہر آنے جانے والے کو اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے گور کر دیکھا کرتا تھا۔ بعد میں نوائے وقت کے دفاتر یہاں سے اُٹھ کر مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ میں آگئے"۔ (۲۱)

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں اردو ادب کے احیا یعنی نئے سفر کے ساتھ ہی ادبی رسالوں اور ادبی کتابوں کی تزئین و آرائش کرنے کے سلسلے میں تیزی آگئی۔ اس حوالے سے مشہور مجسمہ ساز آذر زوبی کا نام سر فہرست ہے۔ زوبی کا آفس کمرشل آفس بیڈن روڈ پر مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی ایک کشادہ گلی کے آخر میں تھا۔ اشفاق احمد اکثر زوبی صاحب سے ملنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ زوبی پینٹنگ اور کمرشل آرٹ کے ماہر تھے۔ بیڈن روڈ پر جہاں ان کا آفس تھا وہیں ان کا سٹوڈیو بھی تھا۔ اے حمید لکھتے ہیں:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

"جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا ایک مکان اچھرہ میں بھی تھا۔ زوبی کا ایک سٹوڈیو باغِ جناح کی اوپن ایئر والی پہاڑی کے اوپر بھی تھا۔ جہاں بعدیں صادقین صاحب نے اپنا سٹوڈیو بنایا۔ آذر زوبی ورزشی جسم والا خوبصورت ادمی تھا۔ بعد میں وہ کراچی شفٹ ہو گیا۔ آخری بار میں اسے کراچی میں ملا تو اس نے رات کے کھانے پر مجھے اپنی انگریزی میں لکھی کتاب "SOMETHING WITH OUT COLOUR" پیش کی۔ اس نے کتاب پر لکھا۔۔۔

"بہت ساری حسین یادوں کے ساتھ اپنے اے حمید کے لیے۔۔۔

آذر زوبی

87-8-23 کراچی"

کتاب میں زوبی کا بنایا ہوا سعادت حسن منٹو کا بڑا خوب صورت سکیچ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اسی کتاب میں ظہیر کاشمیری، اشفاق احمد، سید امتیاز علی تاک اور مولانا صلاح الدین کے زوبی کے بنائے ہوئے مجسموں کی فوٹوز بھی شامل ہیں"۔ [۲۲]

آرٹسٹ زوبی کا ذکر اے حمید نے لاہور کے گمشدہ مناظر کے سلسلے میں کیا ہے۔ اے حمید کے ناول " جنگل روتے ہیں" کا سرِ ورق بھی زوبی کا بنایا ہوا ہے۔ زوبی صاحب کی طرح اب اُن کا آفس بھی گمشدہ چیزوں میں شامل ہے۔

جس بلڈنگ میں زوبی کا آفس تھا اس سے ذرا آگے کشمیر سٹور تھا جس سے دو قدم کے فاسلے پر "CHALET" نام کا کافی ہاؤس تھا۔ یہاں فرنچ کافی اور سینو چز ملا کرتے تھے۔ یہاں کی کافی بے حد لذیذ اور کریم والی ہوا کرتی تھی۔ کشمیر سٹور تو موجود ہے مگر کافی ہاؤس اب غائب ہو چکا ہے۔

اس کافی ہاؤس کے ساتھ "انڈس ہوٹل" ہوا کرتا تھا جو اب بھی موجود ہے مگر اب اس کی حالت بدل چکی ہے۔ اے حمید لکھتے انڈس ہاٹل کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس ہوٹل کا نام انفسٹن ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ کراچی کے معروف فلمی رسالے "نگار" کے مالک اور چیف ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب اور نامور شاعر مجید امجد لاہور آتے تو اسی ہوٹل میں ٹھہرتے تھے"۔ [۲۳]

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

الیاس رشیدی اور مجید امجد دونوں سے ہی اے حمید کے تعلقات مضبوط تھے۔ الیاس رشیدی کے متعلق اے حمید لکھتے ہیں:

"الیاس رشیدی صاحب بڑی محبت کرنے والے اور دوستوں کے کام آنے والے انسان تھے۔ میں "نگار" رسالے کے لیے مضمون بھیجتا تو اس کا معاوضہ اسی وقت منی آرڈر کر دیا کرتے تھے انھیں لاہور آنا ہوتا تو مجھے خط لکھ دیتے۔ میں فلاح تاریخ کو لاہور پہنچ رہا ہوں، دو تین مضمون اکٹھے لکھ رکھنا۔ میں مضمون لکھ رکھتا۔ جب وہ لاہور آتے تو میں مضمون لے کر انڈس ہوٹل پہنچ جاتا۔ بڑی محبت اور پیار سے ملتے۔ مضمون لے کر بریف کیس میں رکھتے اور مجھے اسی وقت معاوضہ دے دیتے"۔ (۲۴)

ساہیوال سے مجید امجد لاہور آتے تو وہ بھی انڈس ہوٹل ٹھہرتے۔ سینئر شعرا میں مجید امجد کا بڑا مقام تھا۔ ایک نقاد نے تو اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ ایسا باکمال نظم گو شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اے حمید کے ساتھ مجید امجد صاحب کا سلوک بڑا مشفقانہ تھا۔ اے حمید لکھتے ہیں:

"جب بھی لاہور آتا کسی کے ہاتھ پیغام بھیج کر مجھے بلوا لیتا۔ مجھے پتہ چلتا تو میں خود انڈس ہوٹل اس کے کمرے میں پہنچ جاتا وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ بڑے موٹے شیشوں والی عینک لگاتا تھا۔ بزدلی کی حد تک شریف اور ڈرا ڈرا انسان تھا۔ مگر شاعر کمال کا تھا۔ نظم لکھنے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دھیمے سروں میں بات کرتا تھا۔ بات کرتے وقت اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی بڑی بڑی آنکھیں فرط حیرت سے پوری کھلی ہوتی تھیں جنھیں دیکھ کر میرے بدن میں تشویش کی لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے بھی اس کی نظر کمزور تھی اور وہ شام کے وقت بغیر کسی دوست کے سہارے کے مال روڈ پر نہیں نکلتا تھا۔ اس کی گفتگو بڑی دانشورانہ ہوتی تھی۔ اردو شاعری اور افسانہ نگاری پر بڑی عالمانہ باتیں کیا کرتا تھا جو میری سمجھ سے باہر ہوتی تھیں مگر میں اسی طرح سر ہلایا کرتا تھا جیسے اس کی ساری باتیں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں"۔ (۲۵)

مجید امجد کو کلاسیکی موسیقی سے بھی شغف تھا۔ مجید امجد کو راگ درباری بہت پسند تھا۔ اے حمید کہتے ہیں:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

"ایک روز انڈس ہوٹل کے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے جب مجید امجد نے مجھ سے راگ درباری سنانے کی فرمائش کی تو پہلے تو میں ایک سیکنڈ کے لیے گھبرا گیا۔ پھر یہ سوچ کر حوصلہ ہوا کہ اگر مجھے راگ درباری کی سمجھ نہیں تو مجید امجد کو اس راگ کی کون سے سمجھ ہے۔ میں نے پیشہ ور کلاسیکی گویے کی طرح ذرا سا گلا صاف کیا اور جس طرح ریڈیو سٹیشن پر ایک مشہور کلاسیکی گویے کو کسی پکے راگ کی ریکارڈنگ کرواتے دیکھ رکھا تھا اسی طرح سے آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور راگ درباری گانا شروع کر دیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو میں گا رہا تھا وہ کون سا راگ تھا۔ راگ تھا بھی یا نہیں۔ بہر حال مین اسے راگ درباری ہی سمجھ کر گا رہا تھا اور چونکہ شریف آدمی مجید امجد کو راگوں کی سمجھ نہیں تھی اس لیے وہ اسے راگ درباری ہی سمجھ کر سن رہا تھا اور سر ہلا رہا تھا۔ اس وقت اگر کمرے میں کوئی راگ ودیا کو سمجھنے والا شخص موجود ہوتا اور مجھے راگ درباری گاتے سن لیتا تو مجھے اٹھا کر انڈس ہوٹل کی کھڑکی سے نیچے پھینک دیتا۔ اگر ایسا نہ کر سکتا تو خود کھڑکی سے مال روڈ پر چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتا۔"(۲۶)

انڈس ہوٹل کے آگے فیروز سنز کی بلڈنگ آتی ہے۔ فیروز سنز سے پہلے یہاں ایک کشادہ دکان ہوا کرتی تھی جہاں شراب فروخت ہوتی تھی۔ اب اسی دکان پر کتابیں ملتی ہیں۔ فیروز سنز سے آگے کہاں الفلاح کی عمارت ہے وہاں ایک تکونا باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ اے حمید باغیچے کے متعلق لکھتے ہیں:

"باغیچے کے وسط میں انگلش کاؤنٹیز کے مکانوں کی وضع کا ایک پرانا کاٹیج ہوتا تھا جس میں پنجاب گورنمنٹ کے کسی محکمے کا کوئی دفتر تھا۔ اس محکمے کا ایک رسالہ بھی نکلتا تھا۔ کچھ عرصہ اس رسالے کا ناصر کاظمی بھی ایڈیٹر رہا تھا۔ یہاں رات کے وقت میں یوسف کامران، حبیب جالب اور ایک مشہور شاعر بیٹھا کرتے تھے اور شعر و سخن کی باتیں کیا کرتے تھے"۔(۲۷)

لاہور کا آرٹ کونسل بھی لاہور کا تاریخی ورثہ ہے۔ یہاں ایک چھوٹا اور لمبائی کے رخ کا کمرہ ہوا کرتا تھا جہاں ڈرامے سٹیج ہوا کرتے تھے۔ یہ بڑے معیاری اور ادبی ڈرامے تھے۔ اور یجنل پلے بھی سٹیج ہوتے اور انگریزی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈراموں کے اردو ورژن بھی سٹیج کیے جاتے۔ ان دنوں آرٹس کونسل آرٹ، پینٹنگز اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اے حمید اس آرٹس کونسل کا منظر نامہ یوں پیش کرتے ہیں:

"شام کے وقت آرٹس کونسل کی پرانی کوٹھی نما عمارت کے برآمدے اور کشادہ لان میں شاعر، مصور، ادیب اور نقاد حضرات اکثر بیٹھے چائے پیتے اور ادب اور آرٹ پر گرم جوشی سے باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ آرٹس کونسل کا لان بڑا کشادہ اور گول دائرے کی شکل میں تھا جس میں چیڑھ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ چیڑھ کے درخت کوہ مری اور ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر ہوتے ہیں۔ آرٹس کونسل کے چیڑھ کے درختوں سے کوہ مری اور نتھیا گلی کی کہساروں کی ٹھنڈی ہوائیں ملنے آیا کرتی تھیں۔ شام کے علاوہ دن کے وقت بھی لان کے سبزہ زار میں ادب اور آرٹ کے طالب علم چائے پیتے ہوئے پینٹنگ، مجسمہ سازی اور ڈرامے پر بحث کیا کرتے تھے۔ بڑا علمی اور علمی ادبی ماحول ہوتا تھا اس آرٹس کونسل کا۔ چھوٹے سے لمبے کمرے کے سٹیج پر شیکسپیئر، مولیئر، ابسن اور کبھی کبھی کلاسیکی یونانی ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ پنجابی اور اردو کے طبع زاد ڈرامے بھی سٹیج کیے جاتے تھے۔ ہال میں گہری خاموشی ہوتی تھی۔ لوگ ایک ایک مکالمے کو کلاسیکی ادب کا انمول خزینہ سمجھ کر ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے اور ان میں شک نہیں کہ وہ مکالمے ادب کے جواہر پارے ہوتے تھے۔ افسوس کہ زوال پذیر سٹیج نے ہماری نئی نسل کو ان جواہر پاروں سے محروم کر دیا"۔ (۲۸)

آج کل جو کچھ سٹیج ڈراموں کے نام پر کھیل کھیلا جارہا ہے انھیں دیکھ اور سن کر محسوس ہوتا ہے کہ کسی شادی بیاہ والے گھر میں بھانڈ میراثی جگت بازی کر رہے ہیں۔ جگت بازی ایک فن ہے لیکن موجودہ دور میں اس فن کی فنیت مار دی گئی ہے۔ سٹیج ڈراموں کو دیکھ کر عزیز احمد کے ناول کا ایک عنوان یاد آجاتا ہے کہ "ایسی بلندی ایسی پستی"۔

لاہور آرٹس کونسل، وائی ایم سی بریڈلے ہال، برکت علی محمڈن ہال اور ایس پی ایس کے ہال، لاہور کی سماجی، سیاسی، تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی روایات کے امین تھے۔ ان کے درودیوار آج بھی گزشتہ زمانے کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کے بہت سی چیزیں محض قصہ پارینہ ہو چکیں۔ یہ عمارات اور یہاں کا کلچر اس قدر بدل چکا ہے

ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

کہ اگر اس زمانے کا انسان موجودہ حالات دیکھ لے تو پہچاننے سے انکار کر دے۔ یہی چیز ہمیں اے حمید کے کالموں میں بھی نظر آتی ہے کہ موجودہ دور گزشتہ دور سے تیز رفتار اور اس حالات سے بہت مختلف ہے جنھیں وہ دیکھتے اور محسوس کرتے آئے ہیں۔ لاہور کا منظر نامہ ہر گزرتے وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا۔ اے حمید اپنی کتاب "بارش، سماوار، خوشبو" میں لاہور کی عمارتوں کی شکستگی، لاہور کی ثقافت جو مٹنے کے قریب نظر آتی ہے، فن تعمیر کے شاہکاروں سے عدم توجہی، لاہور کی ادبی شخصیات جو ماضی کا حصہ بنیں اور ریڈیو پاکستان کے معیار کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں عمر رفتہ کا نوحہ سناتے ہیں۔ یہ کتاب "بارش، سماوار، خوشبو" ایک شاہکار ہے جو اے حمید کے فن اور لاہور کی پرانی یادوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

حوالہ جات

۱. اردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور، فیروز سنز، ۲۰۱۶ء، ص ۵۱۹
۲. اے حمید، بارش، سماوار اور خوشبو، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰
۳. ایضا، ص ۱۳
۴. ایضا، ص ۲۱
۵. ایضا
۶. ایضا، ص ۲۳
۷. ایضا، ص ۴۹
۸. ایضا، ص ۶۲
۹. ایضا، ص ۶۵
۱۰. ایضا، ص ۶۶
۱۱. ایضا، ص ۶۷
۱۲. ایضا
۱۳. ایضا، ص ۹۸
۱۴. ایضا، ص ۱۰۳
۱۵. ایضا، ص ۱۷۱

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

۱۶. ایضا، ص ۱۷۴،۱۷۵

۱۷. ایضا، ص ۱۸۵،۱۸۶

۱۸. ایضا، ص ۱۹۵

۱۹. ایضا، ص ۲۰۰،۲۰۱

۲۰. ایضا، ص ۲۰۶

۲۱. ایضا، ص ۲۰۹

۲۲. ایضا، ص ۲۱۰

۲۳. ایضا، ص ۲۱۲

۲۴. ایضا

۲۵. ایضا، ص ۲۱۳

۲۶. ایضا، ص ۲۱۴

۲۷. ایضا، ص ۲۱۵

۲۸. ایضا، ص ۲۱۷،۲۱۸